© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یوں تو اسلام ہمیشہ ملحدین و منافقین کی تاویل بازیوں اور فتنہ آرائیوں کا تختۂ مشق رہا ہے لیکن اس کے ساتھ جو افسوسناک سلوک پاکستان کے تجدد پسند اصحاب کر رہے ہیں، اس کی داستان بڑی ہی الم انگیز ہے۔ یہ کیرکٹر تو سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی جس چیز کو نہ مانے، خم ٹھونک کر اس کی مخالفت کرے اور جس چیز کو مانے اس کے لیے جان کی بازی لگا دے۔ لیکن یہ کیرکٹر سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی ایک چیز پر ایمان کا دعویٰ کرے، اس کے خدائی اور آسمانی ہونے کا اقرار کرے اور دوسری طرف اس کے ایک ایک جزء اور ایک ایک پہلو پر شبہات وارد کرے، اور اس میں ترمیم کی تجویزیں بھی پیش کرتا چلا جائے۔

آج کل اس قسم کے سوالات ہمارے ہاں خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھائے جا رہے ہیں مثلاً یہ کہ ضبط ولادت اسلام میں جائز ہے یا ناجائز؟ مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ پردہ منشائے شریعت کے مطابق ہے یا مخالف؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے احکام وقتی ہیں یا ابدی؟ ان میں سے کونسے ایسے ہیں جو ہنگامی ہیں اور کونسے ایسے ہیں جن کی پیروی تمام زمانوں میں، ہر قسم کے حالات میں لازم ہے۔ رقص و سرود اور عیش و طرب کی مجالس کے انعقاد کی اسلام کہاں تک.... اجازت دیتا ہے۔ یہ سوالات عقل باور نہیں کر سکتی کہ کسی ایسے شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکیں جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ سوالات تو صاف، ایسے ذہنوں کی پیداوار ہیں جن کا اسلام سے کوئی ربط باقی نہیں رہا ہے لیکن وہ اسلام سے کھلم کھلا اپنی بغاوت کا اعلان اس وجہ سے نہیں کرتے کہ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اسلام کو جتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور جتنا مسلمانوں کے ذہنوں کو الجھا سکتے ہیں اتنا وہ اس شکل میں نہیں کر سکتے جبکہ وہ اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سوالات جو آئے دن نت نئے فتنوں کی صورت میں ابھارے جاتے ہیں اُن کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ واقعی یہ ہمارے قومی مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے ہمارے بہی خواہانِ قوم سخت مضطرب ہیں اور اُنہیں اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ اگر ان کا بروقت حل تلاش نہ کیا گیا تو ہمارے سفینۂ حیات کو وقت کی بیرحم موجیں پاش پاش کر دیں گی۔ دراصل ان مسائل کو فتنوں کی شکل میں یہاں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق زبردستی پیدا کیا جا رہا ہے کیونکہ اسلام کے بارے میں اب "متفرنجین" کی دلی آرزوئیں پوری ہونے کی کوئی دوسری صورت بجز اس کے ممکن نہیں رہی ہے کہ اس کے اندر سے نقب لگائی جائے۔

اسلام کے راستے میں مزاحمتیں ماضی میں بھی پیش کی گئیں لیکن ماضی کے دشمن اتنے بزدل اور تھڑدلے نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ وہ جب مخالفت کرتے تو بالکل کھل کر کرتے، بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کرتے۔ اور جب اسے قبول کرتے تو پھر اس میں بھی وہ مخلص ہوتے تھے۔ دشمن تو وہ بلاشبہ تھے لیکن ان میں چند بنیادی انسانی خصوصیات ایسی تھیں جن کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اُن کے مقابلہ میں آج کا دشمن بڑا ہی دون ہمت اور کمزور ہے۔ وہ سامنے آکر کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ چھپ کر شبخون مارتا ہے۔ اُس نے میدانِ جنگ میں کھڑے ہو کر لڑنے کی بجائے گوریلا وار کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہاں اسلام کا راستہ روکنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن اس مزاحمت میں بھی اُس کی روش بڑی ہی بزدلانہ تھی۔ اُس نے کبھی کھل کر یہ نہیں کہا کہ ہمیں اسلام نہیں چاہیے۔ اس کے بجائے اس نے ہزار حیلے بہانے بنا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کیے کہ دیکھو! اگر پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا گیا تو اس کے یہ اور یہ نقصانات ہونگے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کو یہ یقین ہی نہ رہے کہ آج دنیا میں اسلامی قانون کسی مملکت کی بنیاد بن سکتا ہے۔

جب اس کے یہ سارے حربے ناکام ہوئے اور قوم نے اس کے منہ سے یہ اگلوا ہی لیا کہ یہ سرزمین پاک اسلام ـــ اور صرف اسلام ـــ ـــ کے لیے وقف ہے اور یہاں کا نظامِ حیات وہی ہوگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو اللہ اور اُس کے رسول نے ہمیں دیا ہے تو اُن حالات میں ایک باضمیر انسان کی طرح اس گروہ کا فرض تھا کہ اگر اُسے یہ بات قابلِ قبول نہ تھی تو وہ میدان سے ہٹ جاتا لیکن اُس نے محض جاہ و منصب کے لالچ میں اپنے ضمیر کا خون کیا اور نظریاتی اختلاف کے باوجود مسندِ اقتدار پر متمکن رہا۔ مگر ابھی تک اس نے اپنی مخالفانہ روش نہیں چھوڑی بلکہ اس کی مسلسل کوشش یہی ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں نے ریاست کے اردگرد اسلامی دستور کا جو بند باندھا ہے اور جس دستور کی وفاداری کا عہد کر کے اُسے یہ اقتدار نصیب ہوا ہے، اس میں اب اتنے رخنے پیدا کر دیئے جائیں کہ مغربی معاشرت کا سیلاب اس کے اندر بڑی آسانی سے گھس آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اب یہ بالکل چوہوں کی طرح اس حصار میں اِدھر اُدھر شگاف کرنے میں مصروف ہے۔ کبھی وہ شریعتِ اسلامی کے مجموعی ڈھانچے میں نہایت عیاری کے ساتھ چند ایسی چیزوں کو منتخب کرتا ہے جو جدید تہذیب و تمدن کے دلپسند رواج کے خلاف پڑتی ہیں اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمانوں کے ذہن میں اختلال پیدا کیا جاتا ہے، کبھی علماء کو ہدف بنا کر امتِ مسلمہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہی لوگ وجہِ مصیبت ہیں، کبھی مسلمانوں کو نہایت ہی معصومانہ انداز میں یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو تفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، اُس نے عقلِ انسانی پر کسی قسم کے پہرے نہیں بٹھائے تو ہم پھر پچھلوں کی لکیر کے فقیر بن کے کیوں رہ جائیں؟ یہ باتیں بظاہر بڑی دلکش ہیں لیکن ان کے پس پردہ جو عزائم ہیں وہ ایسے نہیں جن سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔ یہ ساری باتیں بالکل دوسرے مقاصد کے لیے کہی جاتی ہیں ــــ وہ مقاصد جو اسلام کی عین ضد ہیں۔

ان صفحات میں ہم آج اسی مشرب کے ایک گلِ سرسبد کے خیالات پیش کرتے ہیں جن سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کس حکمت اور دانائی کے ساتھ اسلام کے اندر رخنے پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

چند روز ہوئے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں پاکستان کی عدالتِ عالیہ کے ایک معزز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکن نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا :

"مجھے مولانا ابوالحسنات سید احمد کی تقریر کے اس حصہ سے اختلاف ہے جس میں مولانا نے کہا تھا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ضابطے اور قوانین موجود ہیں۔ قرآن مجید واقعی ایک الہامی کتاب ہے اور اس میں حیاتِ انسانی کے متعلق ہدایات بھی ملتی ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ قرآن زندگی کے سارے شعبوں کے بارے میں احکامات دیتا ہے۔ اس نے معاشرت اور اخلاق کے متعلق چند اشارے کر دینے پر اکتفا کیا ہے اور ہمیں تاکید کی ہے کہ ہم عقل و فکر کی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی کی تعمیر کریں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو تدبر اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔

ہمارے قدیم فقہاء نے قرآن مجید سے استخراج کر کے اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق احکامات مرتب کیے۔ وہ احکامات خواہ اپنے دَور کے لیے کتنے ہی قیمتی اور مفید ہوں لیکن وہ عہد جدید کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم اپنے دَور کے لیے نئی فقہ مرتب کریں جس میں اسلام کی ایک ایسی تعبیر ہو جو موجودہ حالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ امتدادِ زمانہ سے ملکوں اور قوموں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، تمدن کے نئے نئے تقاضے اُبھرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ماضی کے فقہی استنباط کو زمانۂ حال کے لیے قبول کر لینا صحیح اور درست نہیں"

صاحبِ موصوف کے یہ خیالات کچھ ایسے نہیں کہ لوگوں سے ڈھکے چھپے ہوں، ان خیالات کا اظہار انہوں نے کئی بار مختلف موقعوں پر کیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کریں۔

مندرجہ بالا سطور کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ فاضل مقرر اپنے سامعین کو مندرجہ ذیل تاثرات دینا چاہتے ہیں :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱) یہ کہ قرآن نے کوئی چیز تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کی بلکہ چند اصولی باتیں بیان کر دی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں تفکر و تدبر کی دعوت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم جو چاہیں اصول اور نظریے وضع کریں۔

(ب) جس معاملے میں قرآن نے ہمیں کچھ اصول دیئے ہیں، اس میں تو ہمیں انہیں کی پیروی کرنی چاہیے لیکن اس باب میں احکام الٰہی کی جو تعبیر و توجیہ ہم کرنا چاہیں اس کا ہمیں پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ باقی رہے زندگی کے وہ معاملات جن کے بارے میں قرآن نے کوئی واضح حکم نہیں دیا اور جن کا تناسب اول الذکر سے کہیں زیادہ ہے، ہمیں صرف اپنے تفکر و تدبر پر اعتماد کرنا چاہیے۔

(ج) چونکہ ہمارے فقہاء اور ائمہ ایک خاص دور اور علاقے میں رہے، اس لیے اُن کی نگاہ صرف اُس دور یا علاقہ کے مادّی حالات میں اُلجھی رہی۔ انہوں نے جو کچھ سوچا صرف اپنے عہد کے لیے سوچا اور جو کچھ کیا صرف اپنے وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر کیا اس لیے فقہ کے جو مختلف مدارس فکر آج سے صدیوں پیشتر انسانی تمدن و اخلاق کی اصلاح کے لیے وجود میں آئے تھے وہ موجودہ ترقی یافتہ اور تبدیل پذیر حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ یہ مذاہب ایک خاص ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، موجودہ زمانہ میں جب کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور انسانی تمدن ایک نئے ارتقائی دور سے گذر رہا ہے، ان مذاہب کے قانونی احکام پر عمل کرنے کی کوشش بے سود اور لایعنی ہے۔

آئیے اب دیکھیں کہ ان ارشادات کے اندر اسلام کی مخالفت کے کیا کیا پہلو چھپے ہوئے ہیں۔

جب اس طرز خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں واضح اور مفصل قوانین موجود نہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضابطۂ حیات کے لیے پنسل کا ایک نہایت ہی مدھم سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے اور پھر انسانوں کو اس بات کی بالکل کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ اس میں اپنے اپنے خیال کے مطابق جس طرح چاہیں رنگ آمیزیاں کرتے رہیں۔ یہ طرزِ فکر اسلام کے بالکل سطحی اور سرسری مطالعہ پر مبنی ہے۔ یہ حضرات اپنے سامنے اسلام کا صرف ایک پہلو رکھتے ہیں مگر دوسرے پہلو کو یکسر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ حقیقت غالباً ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اللہ نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبر بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اس ہادیٔ برحق نے خدا کی پیش کردہ اسکیم کے مطابق حیاتِ انسانی کا رفیع الشان قصر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ تعمیر کر کے دکھا دیا ہے۔ قرآنِ حکیم زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتانے کی بجائے صرف ہر شعبۂ زندگی کے حدود اربعہ کو متعین کر دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگِ نشان کھڑے کر دیتا ہے جو اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیے، لیکن ان ہدایات کے مطابق عملاً انسانی زندگی کی تشکیل اور صورت گری کرنے کا کام سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و راہنمائی کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کے پیش کردہ خاکے میں سے زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات ڈھونڈنا سعی لاحاصل ہی نہیں بلکہ ایک زبردست گمراہی بھی ہے۔

اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ اسی دعوت کا اعجاز تھا کہ مسلمانوں نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، فہم و ادراک کے گیسو سنوارے اور غور و فکر کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام نے جس عقل کی طرف دعوت دی ہے وہ دورِ جدید کی بنجر عقلیت پرستی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اسلام نے دورِ جدید کے عقلیت پرستوں کی طرح عقل کو بے زمام نہیں چھوڑ دیا کہ وہ جدھر چاہے جائے اور جو چاہے کرے۔ اس نے خود عقل کو بھی اس کی حدود و قیود سے آگاہ کیا اور اسے ایک "عقلِ کل" کے تابع ہو کر چلنے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار آیات مل سکتی ہیں لیکن ہم یہاں صرف دو نقل کرتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ...	جو لوگ اس رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں۔۔۔
... وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ	اور جنہوں نے اُس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ (الاعراف - ۱۵۷)

اتارا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ (النساء - ۶۵)

پس نہیں تمہارے رب کی قسم (اے محمدؐ!) وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جو ان کے درمیان واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں بلکہ تمہارے فیصلے کو سر بسر تسلیم کریں۔

قرآن مجید کی یہ تصریحات بالکل کھلے الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے فلاح و کامرانی کا واحد معیار خداوند تعالیٰ کے احکام کا اتباع اور اس کے رسول کی سنت کی پیروی ہے۔ اس کی عقل کی ساری تگ و تاز، اُس کے فہم و ادراک کی ساری جولانیاں صرف اسی ایک مقصد تک محدود ہیں کہ کسی طرح خدا اور رسول کا منشا معلوم کیا جائے۔ اسلام میں بھی تدبر اور تفکر قیمتی اور قابلِ صد ستائش ہے لیکن جہاں غور و فکر سے مراد یہ ہو کہ آدمی بالکل آزاد ہو کر مختلف وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے وہاں ضلالت اور گمراہی ہے اور ایسے فہم و ادراک سے ہر مسلمان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

رہی فاضل جج کی یہ بات کہ فقہا کے سارے استنباط چونکہ اُن کے اپنے اپنے ماحول کی پیداوار تھے، اس لیے وہ وقتی اور عارضی ہیں، حیاتِ انسانی کے نہایت سطحی مطالعہ پر مبنی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی خارجی زندگی اور تمدنی ماحول میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اصول و نظریات میں بھی تغیر کرتے چلے جائیں۔ انسان کا معاشرتی ارتقاء تجربہ کی بنیاد پر قائم ہے اور تجربہ کا تعلق ماضی ہی سے ہے۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ ماضی کے خیالات و تصورات صرف اپنے اپنے زمانے تک محدود تھے اور حال اور مستقبل کے لیے وہ کوئی قیمت نہیں رکھتے تو پھر ہمیں لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے تجربات بالکل بے معنی ہیں کیونکہ تجربات کا سارا مواد گذشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہر آنے والی حالت گذشتہ حالتوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوعی اختلاف رکھتی ہے تو پھر یہ بات ناقابلِ فہم بن جاتی ہے کہ ایک انسان آنے والے حالات و واقعات میں اپنے گذشتہ تجربات سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ ان تجربات کی ترتیب اُن احوال و واقعات کی بنیاد پر ہوئی ہے جنہیں آنے والی حالتوں سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ اس الجھن کو بعض لوگ یہ کہہ کر حل کرتے ہیں کہ نئے حالات میں عقل انسان کی راہ نمائی کرتی ہے۔ مگر اس میں پھر یہ دقت پیش آتی ہے کہ خود عقل تجربہ کا ایک وظیفہ ہے۔ اُسے جو کچھ مواد ملتا ہے تجربہ ہی کے ذریعہ ملتا ہے اور تجربہ کے بغیر اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

اس معاملہ میں جتنا غور و فکر کیا جائے یہی معلوم ہوگا کہ انسان کا انفرادی یا معاشرتی تجربہ صرف اسی صورت میں مفید اور کارآمد ہے جب ہر نئی حالت اور گذرے ہوئے حالات میں کوئی اساسی فرق نہ ہو اور اگر ان کے مابین اختلاف کی نوعیت بنیادی ہو تو پھر ماضی کی ہر چیز ہمارے لیے عبث اور بیکار ہے اور اس قابل ہے کہ ہم اُسے دریا بُرد کر دیں۔ لیکن اصل صورت حال یہ نہیں، ماضی، حال اور مستقبل میں فرق کی نوعیت نوعی نہیں بلکہ سرسری ہے اور اسی بنا پر ہم حال اور مستقبل کی تعبیر ماضی پر کرتے ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس لیے ایک عقل مند انسان ماضی سے انحراف نہیں کرتا بلکہ حال کی ترکیب و تشکیل ماضی کی اساس پر کرتا ہے۔ آج جو محرکات ہمیں تعمیر و تخریب کی طرف لے جاتے ہیں وہ اُن محرکات سے بالکل مختلف نہیں جو گذشتہ زمانوں کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمارے اسلاف کے استنباط ہمارے لیے اسی طرح کارآمد ہیں جیسے کہ ہمارے اپنے عہد کے علما کے۔

پھر اس طرزِ استدلال میں دوسری غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں اسلام کے اساسی فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ فلسفہ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسانی ذہن کی افتاد کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ماوراء سرحد ادراک کو کھینچ تان کر محسوسات کے دائرے میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ذہن مافوق الطبیعی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقائق کو بھی عالمِ طبیعی کے خم و پیچ میں گرفتار کرنے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ یہ غالباً اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے کہ یونانیوں نے اپنے خداؤں تک کو عصریت اور ارضیت کے لباسوں میں ملبوس کرکے انہیں اہلِ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اسلام نے اس طرزِ فکر کو بالکل غلط قرار دیتے ہوئے، اس کے برعکس بالکل دوسرا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اُس کے نزدیک نہ صرف خالقِ کائنات ہر قسم کی مادی آلائشوں سے پاک اور منزّہ ہے بلکہ اُس کے رسول کی سنّت بھی زمان و مکان کی ساری حد بندیوں سے آزاد ہے۔ اسلام نے دنیا پر یہ راز پوری طرح آشکار کر دیا ہے کہ جس طرح قانونِ طبیعی کے مطابق یہ کائنات ایک وحدت ہے اسی طرح قانونِ شرعی کی رو سے بھی یہ ایک ہی ہے۔ امروز و فردا کے درمیان جو حجابات ہمیں نظر آتے ہیں وہ محض ہماری نظر کا دھوکا ہیں ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

چنانچہ دیکھیے مسلمانوں کے ہاں آج تک جتنے ائمہ و صلحاء اور مجتہدین گزرے ہیں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ تم ہمارے اقوال کو زمان و مکان کے مصالح پر پرکھ کر دیکھو اگر وہ ان پر پورے اتریں تو انہیں قبول کر لو اور اگر وہ اس کے مطابق تمہیں نظر نہ آئیں تو انہیں رد کر دو۔ ان بزرگانِ امت نے جس بات پر اپنا سارا زور صرف کیا وہ یہ تھی کہ تم منشائے رسول معلوم کرنے کی کوشش کرو اور اگر کوئی چیز اُس کے خلاف پاؤ تو اسے رد کر دو۔ ہم یہاں ان بزرگوں کے چند اقوال پیش کرتے ہیں:

امام شافعی فرماتے ہیں:

فیما قلت من قول او اصلت من	میں جو بات بھی کہوں اور جو اصول بھی ٹھہراؤں جب
اصل فیبلغ عن رسول اللہ خلاف ماقلت	اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہؐ سے مل جائے
فالقول ما قالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	تو پھر حضور ہی کی بات اصل ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں یہ قطعی فیصلہ صادر فرما دیا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیس لاحد مع اللہ و رسولہ کلام ۔	اللہ اور رسول کی بات کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کے لیے گنجائش نہیں ہے ۔

امام مالک کا قول ہے :

ما من احد الا ھو ماخوذ من کلامہ و مردود علیہ الا رسول اللہ	رسول اللہ کے سوا ہر شخص کے کلام میں قابلِ اخذ اور قابلِ ترک باتیں ہیں۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے :

لا ینبغی لمن لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی	جو شخص یہ نہ معلوم کر سکے کہ ایک بات میں نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ میرے قول پر فتویٰ نہ دے ۔

ائمہ کرام کے یہ اقوال اس حقیقت کے پوری طرح آئینہ دار ہیں کہ ایک مسلمان احکام الٰہی میں جس چیز کی تلاش و جستجو کرتا ہے وہ اپنے دل پسند افکار و نظریات کی تائید نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کی موافقت ہے ۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ چونکہ فقہ اسلامی کی تدوین کرنے والے علماء ایک مخصوص زمانے سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف ممالک کے رہنے والے تھے اس لیے ان کی رائے ہمارے زمانوں کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتی، بالکل غلط ہے اور ایسا تصور بالکل خود فریبی پر مبنی ہے ۔ ہم ائمہ سلف کے اجتہاد کو صرف اس لیے پسِ پشت نہیں ڈال سکتے کہ ان کا زمانہ اور تھا اور ہمارا زمانہ اور ہے، وہ کسی خطۂ زمین سے تعلق رکھتے تھے اور ہم بالکل ایک دوسری سرزمین میں بستے ہیں ۔ اسلامی اجتہاد میں زمان و مکان کا فرق اصل اہمیت نہیں رکھتا ۔ ہم ان ائمہ اور مجتہدین کی اگر کسی بات کو ٹھکرانے کے مجاز ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ احکام الٰہی اور سنتِ نبوی میں ان کی دلیل سے محکم تر کوئی دلیل ہمیں مل جائے ۔ اس لیے اسلام میں کسی کے اجتہاد کو وقتی مصلحتوں کے معیار پر جانچنے کی بجائے اُسے تعلیماتِ رسول پر پرکھا جاتا ہے ۔ اگر کسی امام کا استنباطِ احکام الٰہی اور سنت خیر البشر کی کسی محکم بنیاد پر قائم ہے تو وہ بھی بالکل اٹل اور ناقابلِ تغیر ہے ۔ اگر سارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں کے لوگ بھی مل کر اس میں مصلحت کے پیشِ نظر کوئی ردّ و بدل کرنا چاہیں تو انہیں یہ حق نہیں پہنچتا۔

ان گزارشات سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمیں سرے سے وقت اور حالات کے تغیّر و تبدل کی اہمیت ہی سے انکار ہے۔ ہمارا منشا صرف اسی قدر ہے کہ تعلیماتِ الٰہی زمان و مکان اور اُس کے مصالح کی پابند نہیں وہ ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ فقہا نے جو یہ اصول پیش کیا ہے کہ الاحکام تتغیر بتغیر الزمان تو یہ عارمولا ہر قسم کے قوانین کے متعلق درست نہیں بلکہ یہ انہیں چیزوں کے متعلق صحیح ہے جن پر زمانہ اور وقت کی چھاپ نہایت گہری ہو اور جن کی بنیاد خالصتہً عرف یا مصلحت پر ہو۔ مثلاً ملک کی صنعتی ترقی کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا، ملازمین کے اوقات متعین کرنا، یا ٹکسال وغیرہ کا انتظام و انصرام کرنا، یا ریل گاڑیوں کا انضباط۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم یہاں اجتہاد کے بارے میں ایک بالکل انوکھے نقطۂ نظر کا بھی تذکرہ کردیں۔

آج تک اجتہاد کے لفظ سے امتِ مسلمہ جو کچھ سمجھتی رہی ہے وہ ہے دین کے اصلی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنا۔ اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا عامل اور قاضی بنا کر بھیجا۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو آپ نے دریافت فرمایا:

کیف تقضی اذا عرض لک قضاء؟	معاذ! تم ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کیسے کروگے؟
قال: اقضی بکتاب اللہ!	عرض کیا: کتاب اللہ سے!
قال: فان لم تجد فی کتاب اللہ	ارشاد ہوا: اگر اس میں نہ ملا تو؟
قال: فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	بولے: سنتِ رسول اللہ سے!
قال: فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ	فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملا، تو؟
قال اجتهد برائی ولا آلو	جواب دیا: پھر میں اجتہاد سے کام لونگا اور اپنی سی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھونگا (یعنی میں اجتہاد میں حق وصواب کی تلاش میں اور روحِ شریعت سے قریب تر پہنچنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرونگا)

سرکارِ رسالتؐ یہ جواب سُن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا! اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو اپنی خوشنودی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ ایک واقعہ اجتہاد کی حدود اور طریقِ کار کو متعین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے ائمہ اور فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اجتہاد کی بنیاد احکامِ الٰہی اور اسوۂ رسولؐ ہے اور ان دونوں سے صرفِ نظر کر کے اسلام کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کوئی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا ہے۔

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی لغوی تعریف کرنے کے بعد اس کی فنی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اصولیوں کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔"

امام شاطبیؒ کی الموافقات میں اجتہاد کی یہ تعریف ہے:

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔"

اسی طرح صبحی محمصانی نے اپنی تصنیف فلسفہ التشریع فی الاسلام میں اجتہاد کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لغت میں اجتہاد کے معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش کرنا ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے یعنی دین کے ان سرچشموں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا۔

پھر دورِ جدید کے دو بہت بڑے علما مصطفےٰ احمد الزرقا اور محمد ابوزہرہ نے اسلامی کلوکیم میں اجتہاد کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ بھی مندرجہ بالا تصریحات کے عین مطابق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصطفیٰ احمد زرقا صاحب اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اجتہاد نام ہے نو بہ نو واقعات و مسائل میں شریعت کے تفصیلی دلائل سے شرعی احکام مستنبط کرنے کا"

محمد ابو زہرہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقہ اسلامی میں اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ فقیہ دلائلِ شرعیہ سے عملی احکام مستنبط کرنے کی پوری پوری کوشش کرے"

ہم نے علمائے قدیم و جدید کے جو اقوال نقل کیے ہیں اُن سے ہمارا مقصد اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں آج تک اجتہاد کا جو تصور پایا جاتا رہا ہے وہ صرف ایک ہی ہے کہ زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں رضائے الٰہی اور منشائے رسول کو معلوم کیا جائے۔ یہ دونوں وہ اصل بنیادیں ہیں جن پر اجتہاد کی عمارت تشکیل پاتی ہے اور اگر ان بنیادوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر وہ اجتہاد اسلامی نقطۂ نظر سے اجتہاد نہیں رہتا بلکہ وہ محض آزاد خیالی بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ چیز ایک غیر مسلم کی نظر میں تو ممکن ہے کسی حد تک پسندیدہ ہو لیکن یہ بات کسی ایسے مسلمان کو زیب نہیں دیتی جس نے خدا کو اپنا حاکم اور رسول کو اپنا ہادی اور مطاع تسلیم کیا ہے۔

لیکن اسے ہماری بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آج ایسے ایسے مدعیانِ علمِ دین پیدا ہو رہے ہیں جو اجتہاد کے معاملہ میں نصوص تک کو نظر انداز کر دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس قسم کے خیالات کا چند روز پیشتر ایک عالمِ دین کی طرف سے اظہار کیا گیا ہے۔ وہ دائرہ اجتہاد کی وسعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکثر حضرات نے بربنائے مصلحت نصوص سے متعلق معقول روش اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ اجتہاد و فکر کی تگ و تاز صرف انہی مسائل تک محدود رہے گی جو کتاب و سنت میں مذکور نہیں ہیں اور جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی تصریحات پائی جاتی ہیں ان سے متعلق کوئی مسلمان غور و فکر کرنے کا مجاز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر مہمل ہے اور اس سے زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے موجودہ مسائل کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ خود اجتہاد کے حدود و استناد کا تعلق اجتہاد سے ہے جس میں بہرحال دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ اس بنا پر یہ کیونکر جائز ہوگا کہ صرف ایک ہی پہلو کی صحت پر اصرار کیا جائے۔"

فاضل مقالہ نگار پھر اپنے اس نظریہ کی تائید میں چند تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مزید برآں تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ موقف صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ نے تطلیقات ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا یا اراضی سواد کی تقسیم کو جو عمومی مصالح کے پیش نظر رد کیا اس سے کسی طرح سے بھی اس زاویہ نگاہ کی تائید کا سامان بہم نہیں پہنچ پاتا۔"

مندرجۂ بالا اقتباسات کو ذرا غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ امتِ مسلمہ کو کس چیز کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اسے یہاں سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ نصوص پر بھی وقتی مصلحتوں کے پیش نظر اجتہاد کی قینچی چلائی جاسکتی ہے اور ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بھی ایک مسلمان اپنے ضابطہ حیات کی تشکیل کر سکتا ہے۔

اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اجتہاد کی بنیاد کیا ہے۔ اگر اس کی بنیاد صرف عمومی مصالح ہیں تو پھر اسلامی اجتہاد اور آزاد رائے میں کوئی فرق بجز اس کے باقی نہیں رہتا کہ مسلمانوں نے اپنی قانون سازی کا نام اجتہاد رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے اسی مفہوم کو اپنی اپنی زبانوں اور اپنی بولیوں میں دوسرے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو پھر امریکی پارلیمنٹ، برطانوی ایوانِ عام اور بھارت لوک سبھا کی قانون سازی سب گویا اسلامی اجتہاد ہی ہیں کیونکہ ان کے اراکین کے پیش نظر بھی اپنی اپنی قوم کے عمومی مصالح ہی ہوتے ہیں۔ اسلام میں اجتہاد نصوص کے تضمنات پر کیا جاتا ہے اور اگر اجتہاد اپنی بنیادوں کو خود اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جو "فقیہہ مصلحت بین" کے خیالات و تصورات پر پابندی عائد کرے۔

فاضل مقالہ نگار نے اجتہاد کے نصوص کے بارے میں "اجتہاد" کا جو مسلک پیش کیا ہے وہ بڑا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گمراہ کن ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اپنے دعوے کی تائید میں جو واقعات انھوں نے بیان کیے ہیں وہ ان کی تصدیق کرنے کی بجائے اُن کے بالکل مخالف پڑتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا یا اراضی سواد کی تقسیم کو جن مقاصد کے پیشِ نظر روکا وہ قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول کی ضد نہ تھے۔ بلکہ تعلیماتِ الٰہی کے عین منشا کے مطابق تھے۔ آپ نے ان دونوں فیصلوں کی بنیاد نصوص پر رکھی۔

تطلیقاتِ ثلاثہ کے باب میں جو احادیث وارد ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ دعویٰ تو بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے عہد مبارک میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ حدیثیں دونوں طرح کی ملتی ہیں۔ زیادہ ایسی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد طلاقوں کو بائن قرار دیا گیا اور بعض ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا گیا۔ ہم یہاں صرف دو احادیث پیش کرتے ہیں:

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ جب بنی عجلان کے بھائی نے اپنی بیوی سے لعان کیا تو اس نے کہا یا رسول اللہ، میں بڑا ہی ظالم ہونگا اگر اس کے بعد بھی اس کو بیوی بنائے رکھوں۔ سو اب میری طرف سے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔ (رواہ احمد)

"عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو بیک وقت ہزار طلاقیں دے دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا۔ ان میں سے تین اُن کا حق تھا بقیہ ۹۹۷ سب ظلم و زیادتی ہیں۔ اگر اللہ چاہے گا تو معاف کر دیگا اور اگر چاہے گا تو سزا دیگا۔"

یہ دونوں حدیثیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسی نص کو منہدم کر کے کوئی اجتہاد نہیں کیا بلکہ اپنے فیصلے کی بنیاد سنتِ نبوی پر رکھی۔

صاحبِ موصوف نے اراضی سواد کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ کی جس پالیسی کا ذکر کیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کے دعوے کی کسی طرح بھی مؤید نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جن عمومی مصالح کے پیش نظر عراق و شام کی زمینوں کی تقسیم کی۔ مگر اُس کی بنیاد بھی تعلیمات الٰہی ہی تھی۔ اس تصفیہ میں نہ تو سیدنا عمرؓ کے ذاتی رجحانات کا دخل تھا اور نہ ہی عمومی مصالح ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے اس میں شامل تھے۔ ان زمینوں کی تقسیم پر جو اختلافِ رائے ہوا اُس کا آخری اور قطعی فیصلہ احکاماتِ الٰہی سے ہی حاصل کیا گیا۔ اس پورے واقع کی تفصیلات کتاب الخراج اور کتاب الاموال میں مل سکتی ہیں۔ یہاں ہم اس پوری بحث کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کیا کوئی اجتہاد قرآن اور سنتِ رسول سے صرفِ نظر کرکے بھی کیا جاسکتا ہے۔

عراق و شام فتح ہو جانے کے بعد زمین اور جائداد کے انتظام کے بارے میں مشورہ ہوا۔ مجلس شوریٰ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ یہ زمینیں فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں جس طرح رسول اللہ نے خیبر کا کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کیا تھا۔

امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی، وہ چاہتے تھے کہ خلافت کے زیر انتظام زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔ مجلس شوریٰ کے دیگر ممبر حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عثمان غنیؓ جیسے اکابر صحابہ کی رائیں حضرت عمرؓ کی موافقت میں تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اس فیصلے کی تائید میں فرمایا:

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ ہی لوگوں میں تقسیم کردوں اور بعد میں آنے والوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو۔ کیا آپ لوگوں کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور اس طبقہ میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی؟ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہوگی؟ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں آپس میں فساد کریں گے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنے زوردار الفاظ میں حضرت عمرؓ کے اس موقف کی تائید کی۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے ان سارے دلائل کو جن کی تائید کسی نص سے نہ ہوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی، بعض صحابہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ اور حضرت بلالؓ کا مطالبہ یہ تھا:

"جو مال اللہ نے ہمیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے۔ وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ جس طرح رسول اللہ نے خیبر تقسیم کر دیا تھا۔ یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی ذریت کے لیے ہیں اور بعد والے اپنی ذریت کے لیے ہوں گے۔"

حضرت عمر فاروق نے حضرت عبدالرحمٰن اور حضرت بلال کی اس دلیل کو عمومی مصالح کے پیش نظر رد نہیں کیا، حالانکہ جلیل القدر صحابہ کی اکثریت خلیفۂ دوم کی ہمنوا تھی۔ انھوں نے بجائے اپنا فیصلہ قوت کے زور سے نافذ کرنے کے احکامِ الٰہی سے تائید حاصل کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلہ میں سیدنا عمرؓ نے جو تقریر فرمائی وہ ان کے فہم و ادراک، اُن کی کتاب و سنت سے والہانہ محبت اور اُن کی دقتِ نظر اور وسعتِ قلب کی ایک بہت بڑی شہادت ہے، انھوں نے ارشاد فرمایا:

"میں نے آپ حضرات کو محض اس لیے تکلیف دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ ہی لوگوں نے میرے سر پہ رکھا ہے اُس کے اٹھانے میں میرے شریک ہیں۔ اس وقت مجلس میں میری پوزیشن خلیفہ کی نہیں ہے بلکہ آپ میں کے ہر فرد جیسی ہے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا بالکلیہ اختیار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کہ اس معاملہ میں مشورہ ہو چکا ہے۔ مجلس کے کچھ لوگوں نے میری رائے کی مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ میری مرضی کا اتباع کریں اور حق بات کو چھوڑ دیں میں تو صرف ایک حق بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جس طرح میرے پاس اللہ کی کتاب ہے۔ ویسے ہی آپ لوگوں کے پاس بھی اللہ کی کتاب موجود ہے جو ناطق بالحق ہے اس کو سامنے رکھ کر مجھے مشورہ دیجیے جو کچھ اس میں موجود ہے اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے۔"

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دعوے کی تائید میں سورۃ الحشر کی مندرجہ ذیل آیات پیش کیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو
الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ
إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً
مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ
بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ
فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا
مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (الحشر: ۸-۱۰)

یہ فے کا مال ان مفلس مہاجروں کے لیے ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے، جن کے مال چھین لیے گئے، جو اللہ کے فضل اور اس کے خوشنودی کے طالب ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو پہلے سے اس گھر (مدینہ) میں ایمان کے ساتھ جاگزیں تھے، جو محبت کرتے ہیں ان لوگوں سے جو ان کی طرف ہجرت کرکے آئیں، جن کا حال یہ ہے کہ مہاجرین کو خواہ کچھ بھی دیا جائے وہ اس کا بُرا نہیں مانتے، بلکہ اپنی جانوں پر اُن کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ اُن پر فاقہ ہی کی نوبت آجائے۔ اور جو لوگ اپنے نفس کے لالچی پن سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے بعد آئیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو تقسیم نہ کرنے کا جو فیصلہ صادر فرمایا، اُس کے لیے انھوں نے قرآنِ حکیم کی اس آخری آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے استدلال کیا۔ حضرت عمرؓ کے اس استدلال سے سب نے مکمل طور پر اتفاق کیا اور کہا کہ بس آپ ہی کی رائے اس معاملہ میں درست ہے۔

اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا:

"اب مجھے اطمینان ہوا کہ میں حق پر تھا اور اس معاملہ میں میری رائے درست تھی۔"

قاضی ابو یوسف اس فیصلہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی تصنیف کتاب الخراج

© rasailojaraid.com